راہ معرفت (1)

راہِ معرفت

- قرآن اور مطالعہ کائنات
- احیائے فکرِ دینی

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

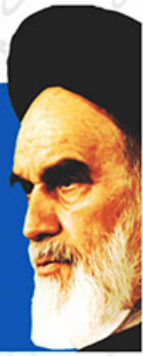

شہید مطہری اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق وغوامض کی بصیرت ومعرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینیؒ

شہید مطہری انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ایؒ

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

راہ معرفت (۱)

۱۔قرآن اور مطالعہ کائنات

اہداف:

۱۔تفکر وتدبر کیوں ضروری ہے؟

۲۔تفکر وغور وخوض کے فوائد کیا ہیں؟

۳۔وحدت عالم کی دلیل کیا ہے؟

تفکر کا اُصول:

قرآن کریم نے غور وخوض اور تفکر وتدبر کی دعوت دی ہے۔مخلوقات خداوندی میں تفکر تا کہ تخلیق کے اسرار معلوم کیے جاسکیں۔اپنے احوال اور اعمال میں تفکر تا کہ اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دیے جائیں۔گزشتہ لوگوں کی زندگی اور تاریخ میں تفکر تا کہ وہ قواعد معلوم کیے جائیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانی جماعتوں کی زندگی کیلئے مقرر کیے ہیں۔

تفکر اگر منتشر اور سطحی ہو تو بہت آسان ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہیں نکلتا لیکن اگر تفکر گہرے مطالعے اور صحیح طریقے پر مبنی ہو اور علمی طریقے سے سرانجام دیا جائے یا کم از کم کوئی آدمی اہل دانش کے نتائج فکر کا ہی بغور مطالعہ کرے تو پھر یہ خاصا مشکل کام ہے لیکن نتیجہ خیز اور مفید اور انسان کی دینی اور روحانی ترقی کیلئے ایک عظیم سرمایہ۔

دین اسلام کا بنیادی رکن توحید ہے۔یہ وہ عظیم ترین تصور ہے کہ انسانی ذہن نے جس تک رسائی حاصل کی ہے مگر یہ نہایت نازک مسئلہ ہے جس کیلئے بڑے غور وخوض کی ضرورت ہے۔اسلام اپنے اُصولوں کے بارے میں خصوصاً سب سے بڑے اُصول توحید کے بارے میں تقلید کی اجازت نہیں دیتا ۔تحقیق کو ضروری سمجھتا ہے۔اسی لیے اسلام لازمی طور پر تفکر وتدبر اور تحقیق وجستجو کو فرض قرار دیتا ہے۔ قرآنی آیات کا ایک بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔

قرآن کریم نے تفکر کے موضوع کو مبہم نہیں چھوڑا ہے۔اس نے صرف یہ کہہ کر بات ختم نہیں کردی کہ جاؤ، غور وفکر کرو، خواہ غور وفکر کا موضوع کچھ بھی کیوں نہ ہو۔اس نے اُصولی طور پر وہ موضوع بھی بتلادیئے ہیں جن پر غور وفکر ضروری ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں مطالعہ کیلئے موضوعات کا تعین کر کے کہا گیا ہے کا جاؤ کمر ہمت باندھو اور ان موضوعات کی تحقیق اور ان کا مطالعہ کرو۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ (بقرہ:164)

آسمانوں کا مطالعہ کرو، زمین کا مطالعہ کرو، ستاروں اور سیاروں کے نظام سے واقفیت پیدا کرو، زمین، اس کے طبقات، اس کے آثار اور ان اسباب کو سمجھو جن کی وجہ سے زمین چوبیس گھنٹے میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کر لیتی ہے جس کے نتیجہ میں رات اور دن کا ظہور ہوتا ہے۔ان سب کا مطالعہ اور

تحقیق کرو۔علم ہیئت کا مطالعہ کرو،علم طبقات الارض سے واقفیت پیدا کرو۔

وَ الْفُلْكِ الَّتِی تَجْرِی فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنفَعُ النَّاسَ (بقرہ:164)

یہ جہاز اور کشتیاں جو سمندر کے سینہ پر رواں دواں ہیں جن سے انسان نفع حاصل کرتا ہے۔مسافت طے کرتا ہے، اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے، تجارت میں فائدہ اُٹھاتا ہے۔اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے، یہ سمندر اور کشتیاں اور کشتیوں کا غرق نہ ہونا، اور وہ سب فائدے جو انسان جہاز رانی کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے، یہ سب کچھ ایک قانون، ایک طریقے اور ایک نظام کے تابع ہے جس سے انسان فقط مطالعہ اور تحقیق کے ذریعے سے ہی آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

وَ مَا أَنزَلَ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْیَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (بقرہ:164)

یہ بارش کا پانی جو اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس سے مردہ زمین میں جان ڈالتا ہے۔اس میں ہزاروں راز پنہاں ہیں جو صرف ان لوگوں کو معلوم ہوسکتے ہیں جو ان کی تحقیق اور مطالعہ میں جان کھپاتے ہیں، فضا اور کائنات کے راز معلوم کرتے ہیں۔بارش کے خواص دریافت کرتے ہیں اور جڑی بوٹیوں کی پہچان حاصل کرتے ہیں۔ **و تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض**۔ ہواؤں کا چلنا اور آسمان وزمین کے درمیان معین بادلوں کی حرکت، سب اللہ کی حکمت وصنعت کی نشانیاں ہیں لیکن ان باتوں کو وہی سمجھتے ہیں جو غور وفکر اور تحقیق وتفتیش کرتے اور تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر ایسا شخص جس سے کبھی آپ کی ملاقات نہ ہوئی ہو، کوئی کتاب تصنیف کرے اور آپ کو خط لکھے کہ اگر مجھ سے مکمل واقفیت حاصل کرنا ہو تو میری کتاب کا مطالعہ کریں اور خصوصاً فلاں فلاں ابواب کو غور سے پڑھیں تو ظاہر ہے کہ یہ ضروری ہے کہ ان ابواب کا پورے غور وفکر سے مطالعہ کیا جائے۔اگر ضروری ہو تو کسی استاد سے بھی مدد لے لی جائے، لغت کی کتاب دیکھی جائے، اس کتاب کا رسم الخط سیکھا جائے یا وہ زبان سیکھی جائے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے تاکہ ہم اس کتاب کو پڑھ کر نادیدہ مصنف سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ظاہر ہے کہ صرف کتاب کی جلد پر اوپری نگاہ ڈال لینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

کائنات کا سطحی مطالعہ جس میں وہ علمی تحقیق شامل نہ ہو جو ہر فن کے علماء مثلاً ہیئت وفلکیات، ارضیات

، حیاتیات، نفسیات، اور قضائیات کے علماء نے کی ہیں، صرف اوپر سے کتاب کی جلد کا دیکھ لینا ہے۔ایسا مطالعہ کافی نہیں اور اس طرح کوئی آدمی بات ٹھیک طور سے نہیں سمجھ سکتا۔اس کے برخلاف ایسا علمی وتحقیقی مطالعہ جس کی بنیاد تفکر اور معلومات کے تجزیہ اور تحلیل پر ہو ایسا ہے جیسے آدمی دریا میں تیر کر ایک طرف سے دوسری طرف جائے۔پس ضروری ہے کہ انسان وسیع معلومات حاصل کرے تاکہ ان پر غور وفکر کرسکے۔پانی ہونا چاہیے تاکہ آدمی اس میں تیر سکے۔

ایسا شخص جو کسی پھول کے پودے سے پوری طرح واقف ہے جو اس کی جڑ، تنے اور پتیوں کو جانتا ہے ، اس کے غذا حاصل کرنے، سانس لینے اور نشوونما پانے کے عمل سے آگاہ ہے، وہی اس پر غور کرسکتا ہے کہ اس پھول کی تخلیق میں کس قدر علم وحکمت اور تدبر وقدرت سے کام لیا گیا ہے لیکن جس شخص کی نظر صرف پھول کی شکل اور اس کے حجم تک ہی محدود ہے اور وہ اس کے خواص سے ناواقف ہے وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کرسکتا کہ اس پھول کا صانع ازلی کی اس حکمت وتدبیر سے کیا تعلق ہے جو تمام عالم میں کارفرما ہے۔

غور وفکر کا دارومدار علم پر ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ جب کسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام کرو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کیلئے جو ضروری تدابیر ہیں وہ بھی اختیار کرو چونکہ غور وفکر علم اور معلومات کے بغیر ممکن نہیں ، اس لیے تفکر وتدبر کے حکم میں مخلوقات کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا حکم بھی شامل ہے کیونکہ غور وفکر ان ہی معلومات کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے لوگوں کو غور وفکر کی ہی ترغیب نہیں دی ہے بلکہ اس آیت میں اور دوسری بہت سی آیتوں میں غور وفکر کے موضوع بھی معین کردیئے ہیں۔

مسلمانوں کا اسلامی غور وفکر کے راستے سے انحراف:

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمان اس راستے کو چھوڑ کر جس پر ان کی مقدس آسمانی کتاب نے ان کو چلایا تھا بالکل مخالف سمت میں چل پڑے۔صرف کچھ تھوڑے سے لوگ جو قرآنی تعلیمات کی روح سے آشنا تھے وہی یہ سمجھ سکے کہ وہ کونسے موضوعات ہیں جن پر غور وفکر مناسب ہے۔پس انہی لوگوں نے ان موضوعات پر غور وفکر کیا، یہی وہ لوگ ہیں جن پر آج نہ صرف عالم اسلام فخر کرتا ہے بلکہ وہ پوری انسانیت کیلئے باعث فخر ہیں۔مگر اکثریت قرآن کے بتلائے ہوئے طریقے سے منحرف ہوگئی اور ان موضوعات پر مباحثہ ومجادلہ شروع کردیا جن کی قرآن نے

نہ صرف ترغیب نہیں دی تھی بلکہ ان میں دلچسپی لینے سے منع بھی کیا تھا۔ جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کو بیکار اور لغو باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ **والذین ھم عن اللّغو معرضون**، خواہ بیکار باتیں علمی یا دینی بحث کا پیرایہ ہی کیوں نہ اختیار کرلیں۔

علم کلام کی بحثیں:

اگر کوئی شخص متکلمین کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور ان مباحث کو دیکھے جن پر متکلمین نے صدیوں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں اور ان مباحث کا ان موضوعات سے مقابلہ کرے جن کے مطالعہ کی قرآن نے ترغیب دی ہے، تو وہ دیکھے گا کہ دونوں میں قطعی کوئی مناسبت نہیں۔ بیکار اور لغو مباحث پر تو لوگ برسوں جھگڑتے رہے اور جن موضوعات کے مطالعہ کی قرآن مجید نے ترغیب دی تھی ان کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ یہاں تک کہ کچھ غیر لوگوں کو شوق پیدا ہوا اور یہ کام انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ چنانچہ وہ دنیا میں سربلند ہوگئے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ سبق جن کو سیکھنے کی ہماری آسمانی کتاب نے ترغیب دی تھی اب ہمیں غیروں سے سیکھنے پڑتے ہیں۔

میں نے پہلے کہا تھا کہ آدمی جتنا موجودات عالم کی بناوٹ میں غور کرتا اور گہرائی میں جاتا ہے وہ اس دنیا کے مختلف اجزاء میں ایک خاص طرح کا ربط، باہمی تعلق اور ہم آہنگی پاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس دنیا میں موجود ہر چیز اور ہر ذرے میں ایک مستقل طاقت اور حرکت ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر بالکل آزاد اور بے تعلق نہیں، دوسرے اجزاء کے ساتھ بھی اس کا ربط اور تعلق قائم ہے۔ اس عالم کا ہر جزو مجموعہ عالم کے ڈھانچے ہی میں اپنا فرض انجام دے رہا ہے اور اپنا مقصد بروئے کار لا رہا ہے اس لحاظ سے تمام عالم ایک وحدت ہے۔

قرآن میں خالق کائنات کا وجود اور وحدانیت:

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کی ایک ہی دلیل دی گئی ہے جو دلیل خدا کے وجود کو ثابت کرتی ہے، ٹھیک وہی اس کی وحدانیت کی دلیل بھی ہے۔ فلسفی عموماً واجب الوجود کے وجود اور اس کی وحدانیت کے ثبوت سے الگ الگ بحث کرتے ہیں۔ مسلمان متکلمین نے بھی فلاسفہ کی پیروی کی ہے لیکن قرآن میں یہ بات نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک جگہ تو اس کی دلیل دی

جائے کہ وہ واجب الوجود قائم بذاتہ ہے، قائم بغیرہ نہیں اور دوسری جگہ اس کی دلیل دی جائے کہ وہ یکتا ہے۔ قرآن کا طرزِ استدلال ایسا حیرت انگیز ہے کہ اس کی موجودگی میں ذات باری کے تعدد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مضمون آیات قرآنی میں تو بطور اشارہ آیا ہے مگر امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کو قرآنی معارف میں شمار کرنا چاہیے جو درحقیقت قرآن کا اعجاز ہے اور اس کا جو تذکرہ حضرت علیؑ نے کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر ایک خاص اعجاز ہے۔

حدیث میں ہے کہ کسی نے امیر المومنینؑ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس بھی کوئی وحی آتی ہے؟

ھل عندکم شیء من الوحی۔ لا، والذی فلق الحبة وبرئ النسمة الا ان یُعطی اللہ عبداً فھماً فی کتابہ

قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو چیرا اور جانداروں کو پیدا کیا، صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ اپنے کسی بندے کو اپنی کتاب کی سمجھ عطا کردے۔

امام علیؑ اس جملے میں یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو حیرت انگیز معارف آپ کے وجود مقدس سے ظاہر ہوئے ہیں وہ نتیجہ ہیں قرآن کے معانی و مقاصد کو سمجھنے اور ان کا ادراک کرنے کا۔

میں نے کہا ہے کہ تخلیق کا جو نظام ہے وہ خود موجودات میں ربط باہمی اور ہم آہنگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اجزائے عالم ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ کسی مجموعہ کے اجزاء میں باہمی ربط و وحدت اور ہم آہنگی کا ہونا بھی ممکن ہے اور نہ ہونا بھی۔ میں ایک مثال سے اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔

بھیڑوں کا گلہ بھی ایک مجموعہ ہے لیکن اس کے اجزاء میں باہمی اتصال اور ہم آہنگی مفقود ہے۔ ہر بھیڑ خود چلتی ہے، گھاس چرتی ہے، خود سوتی ہے۔ بھیڑوں کے مجموعہ کی بناوٹ ایسی نہیں کہ اس سے خود بخود کوئی وحدت تشکیل پاسکے۔ بھیڑوں میں ہم آہنگی صرف اسی قدر ہے کہ ان کو ایک گڈریا ہانکتا ہے۔ لیکن ہر بھیڑ کے جسم میں لاکھوں کروڑوں زندہ خلیے موجود ہیں جن میں سے کچھ جلد کی بافتوں کی تشکیل کرتے ہیں اور باقی تمام اجزاء کیلئے غلاف کا کام دیتے ہیں، کچھ پٹھوں کی تشکیل کرتے ہیں، اسی طرح کچھ دل کی بناوٹ میں کام آتے ہیں اور کچھ آنکھ کی۔ غرض یہ سب متفرق اور الگ الگ کام کرتے ہیں۔ سب کا اپنا اپنا کام اور الگ الگ مقصد ہے۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی کچھ خبر نہیں۔ خون کے خلیوں کو

معلوم نہیں کہ گوشت کے خلیے بھی موجود ہیں۔ گوشت کے خلیوں کو اعصاب کے خلیوں کا علم نہیں۔ اعصاب کے خلیے، جلد کے خلیوں کے وجود سے بے خبر ہیں۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ وہ سب مل کر ایک مجموعے اور ایک وحدت کیلئے کام کر رہے ہیں۔ جس کا نام بھیڑ ہے۔ اور اس کی اپنی زندگی اور اپنا مقصد ہے جو ان سب خلیوں کے الگ الگ مقاصد سے بلند تر ہے۔ یہ سب خلیے اجزاء ہیں، ایک کُل کے، یہ سب وسائل ہیں، ایک زیادہ بڑے مقصد کے۔

چونکہ آج کی رات ماہ رمضان المبارک کی انیسویں شب اور مولائے متقیان حضرت علیؑ کے زخمی ہونے کی رات ہے، میں اس مناسبت سے اپنی گفتگو کا اختتام آپ کے کچھ حالات بیان کر کے کرتا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے امیر المومنین علیؑ کے قاتل کو اشقی الآخرین کا لقب دیا تھا۔ رسول خداؐ کوئی بات ایسے ہی نہیں کہہ دیتے تھے۔ آپ نے اس کو یہ لقب اس لیے دیا تھا کہ اس نے حضرت علیؑ کی شہادت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ عظیم ہستیوں کا وجود تو ہمیشہ ہی غنیمت اور مفید ہوتا ہے مگر کبھی اجتماعی نقطہ نظر سے ان کی پوزیشن ایسی ہو جاتی ہے کہ کسی خاص موقع پر ان کی اہمیت بے حد بڑھ جاتی ہے۔

کبھی کبھی کسی اجتماعی شخصیت کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ پوری قوم کی قسمت کا فیصلہ اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایسے نازک مرحلے میں اس شخصیت کا چلے جانا حق کا خاتمہ اور ایک مسلک اور ایک دور کا خاتمہ بن جاتا ہے۔

حضرت علیؑ نے اپنے دورِ حیات میں فرمایا تھا کہ جب تک میں موجود ہوں، لوگ دو جماعتوں میں حج کر رہے ہیں۔ آپ کا مقصد یہ کہنا نہیں تھا کہ دو امیر الحجاج ہیں بلکہ یہ بتلانا تھا کہ اس وقت لوگوں کے دو مسلک ہیں، زندگی کے دو طریقے ہیں، ان دنوں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی معاویہ نے بنائی تھی جس میں اہل دنیا کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ دوسری پارٹی علیؑ کی تھی جو واقعی اسلام، قرآن، اسلامی احکام اور سماجی انصاف کے حامیوں کی جماعت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد سب ایک ہی جماعت ہو کر حج کیا کریں گے۔ **یحجون صفاً واحداً**۔ بات ایک طرف ہو جائے گی اور واقعی ہوا بھی یہی۔ حضرت علیؑ کے بعد اس معاملے کا فیصلہ ہو گیا۔

یہ ہے شہادت علی کا سانحہ، علیؑ کو بارگاہ خداوندی میں جو تقدس اور قرب حاصل تھا اس سے قطع نظر آپ ملت اسلامیہ کی زبان تھے جس کا اثر تاریخ میں قائم و دوائم رہے گا۔

عبدالرحمٰن بن ملجم بذات خود ایک خارجی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو علیؑ کی تکفیر کرتے تھے۔ یہ لوگ معاویہ کو بھی کافر کہتے تھے۔ خوارج چاہتے تھے کہ ان دونوں کا اور عمرو بن عاص کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔ تین آدمیوں نے مکہ میں باہم طے کیا کہ ان تینوں کو ایک ہی رات حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔ انہی میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی تھا۔ جو شخص عمرو بن عاص کے قتل کیلئے مقرر ہوا تھا وہ مسجد میں گیا لیکن اس رات عمرو بن عاص کی نیابت کوئی اور شخص کر رہا تھا جو بظاہر مصر کا قاضی تھا۔ وہ نماز پڑھا رہا تھا، قاتل اس کو پہچان نہ سکا اور وہ ناواقفیت میں مارا گیا۔ جو شخص معاویہ کے قتل پر مامور تھا، اس نے اپنا وار کیا لیکن ضرب اتنی کاری نہیں پڑی کہ وہ قتل ہو جاتا۔ فقط عبدالرحمٰن بن ملجم اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

حضرت علیؑ کے اس طرح دنیا سے اُٹھ جانے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ اسلام کی خطرناک ترین پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ حضرت علیؑ کی شہادت محض ایک شخص کی موت نہیں تھی، ان کی اپنے مخالفین سے جنگ بھی شخصی نوعیت کی نہیں تھی جس میں ایک فریق کی فتح کے بعد ایک شخص دوسرے شخص کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ عقیدہ اور مقصد کی جنگ تھی، مسلک کی جنگ تھی، طرزِ حکومت کی جنگ تھی۔ ایک فریق کا طرزِ حکومت انبیاء اور اولیاء کا سا تھا، دوسرے فریق کا فراعنہ اور جبابرہ کا سا، یہ توحید و شرک اور عدل و ظلم کا مقابلہ تھا لہٰذا حضرت علیؑ کے ساتھ ہی اور بھی بہت سی چیزیں دفن ہو گئیں۔

سوالات

۱۔ تفکر و تدبر کی دعوت کیوں دی گئی ہے؟

۲۔ تفکر کس لیے کیا جائے؟

۳۔ کونسا تفکر نتیجہ خیز اور مفید اور انسان کی دینی اور روحانی ترقی کیلئے عظیم سرمایا ہے؟

۴۔ کن موضوعات پر غور و فکر کرنا ضروری ہے؟

۵۔ غور و فکر کا دار و مدار کس چیز پر ہے؟

۶۔ مسلمانوں کا اسلامی غور و فکر سے انحراف کیوں ہوا؟

۷۔ اغیار کیوں سربلند ہوئے؟

۸۔ کس لحاظ سے تمام عالم ایک وحدت ہے؟

۹۔رسول اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ کے قاتل کو اشقی الآخرین کا لقب کیوں دیا؟

۱۰۔امیرالمومنینؑ کے اس جملہ "جب تک میں موجود ہوں لوگ دو جماعتوں میں حج کررہے ہیں" سے کیا مراد ہے؟

۱۱۔حضرت علیؑ کی شہادت کا قدرتی نتیجہ کیا ہوا؟

۲۔احیائے فکری دینی

اہداف:

۱۔دین انسان کی فردی اور اجتماعی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

۲۔احیائے فکر دینی کی ضرورت؟

۳۔مسلمانوں کے انحطاط کا سبب جاننا؟

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

(الانفال:24)

موضوعِ سخن "احیائے فکری دینی" ہے۔ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خیال آئے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔کیا یہ ہمارا فریضہ ہے یا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ دین کے احیاء کی کوشش کریں۔اصل میں بات تو اس کے برعکس ہے۔یہ تو دین کا کام ہے کہ ہمارا احیاء کرے۔ہم کیسے دین کا احیاء کر سکتے ہیں؟اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض شاید اعتراض کریں کہ یہ عنوان تو خود اس آیت کے مضمون سے متصادم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے مومنین! خدا اور رسول جس کام کی تمہیں دعوت دیں اس کو قبول کرو۔رسولؐ تمہیں ایسے کام کی دعوت دیتے ہیں (یعنی دین کی) جو تمہیں زندہ کرے گا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین خود ایسی چیز ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور جن کو زندگی ملتی ہے وہ ہم انسان ہیں،ایسی صورت میں احیائے فکر دینی کا کیا معنی؟

میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری گفتگو کا عنوان احیائے فکرِ دینی ہے،احیائے دین نہیں اور اگر ہمارا موضوع احیائے دین ہوتا تب بھی کوئی تضاد نہیں تھا۔اس لیے کہ جہاں دین ہمیں زندگی بخشتا ہے وہاں ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم دین کو زندہ رکھیں۔اس میں قطعاً کوئی منطقی مغالطہ نہیں ہے۔دین کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے اور دین بھی ہمیں زندگی بخشتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ جس چیز پر ہماری زندگی کا دارومدار ہو ہم اس کی حفاظت کریں۔یہ ایسی ہی بات ہے جیسے پانی ہماری زندگی کیلئے ضروری ہے مگر ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ پانی کو صاف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھیں۔پانی کے بارے میں یہ ہماری ذمہ داری ہے لیکن پانی کی اپنی بھی ایک خاصیت ہے جو خداوند تعالیٰ نے اس میں قرار دی ہے۔

علاوہ ازیں خود آیات واحادیث میں دونوں باتوں کا ذکر آیا ہے۔ابھی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں ہے کہ دین تمہیں زندگی عطا کرتا ہے اسی طرح صراحتاً یا اشارتاً ہمیں جابجا یہ بھی حکم دیا گیا

ہے کہ ہم دین کو زندہ کریں اور زندہ رکھیں۔ اس فرض سے غافل نہ ہوں کہ دین کو زندہ رکھنا ہے اور اس کو کبھی مرنے نہیں دینا۔

امام علیؑ نے اپنے اس مشہور خطبے میں جو غالباً آپ کا آخری خطبہ تھا اپنے مخلص رفقاء کی توصیف کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے دین کو زندہ رکھا۔ نوف بکالی نے بیان کیا ہے کہ علیؑ اس پتھر پر کھڑے ہوئے تھے جو جعدہ بن ہبیرہ نے لاکر رکھا تھا، وَعلَیہِ مِدرَعَۃٌ مِّن صُوفٍ۔ وہ اس وقت پشمینہ کا چوغہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار کی حمائل کھجور کے ریشہ کی تھی۔ ان کے نعلین بھی اسی کے تھے۔ آپ اس پتھر پر کھڑے ہوئے اور اس سے خطبہ کیلئے منبر کا کام لیا اور ایسا عجب اور شاندار خطبہ دیا کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر میں آپ نے اپنے دوستوں کو یاد کر کے فرمایا:

اَینَ اِخوَانِیَ الَّذِینَ رَکِبُوا الطَّرِیقَ وَ مَضَوا عَلَی الحَقِّ

میرے وہ بھائی کہاں ہیں جو راہِ حق کے رہرو تھے، انہوں نے جادۂ حق پر قدم رکھا اور حق پر دنیا سے اُٹھ گئے

اَینَ عَمَّارُ اَینَ ابنُ التَّیِّهَانِ اَینَ ذُو الشَّهَادَتَینِ

عمار بن یاسر کہاں ہیں؟ ابوالہشیم التیہان کہاں ہیں؟ خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین کہاں ہیں؟ یہ فرما کر آپ کی حالت متغیر ہوگئی اور شاید آپ رونے لگے پھر فرمایا:

اَو هِ عَلَی اِخوَانِیَ الَّذِینَ قَرَاُوا القُرآنَ فَاَحکَمُوهُ

آہ! میرے وہ بھائی جنہوں نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا۔

وَ تَدَبَّرُوا الفَرضَ فَاَقَامُوهُ

جنہوں نے اپنے دینی فرائض پر غور کیا اور ان کو ادا کیا

وَ اَحیَوُا السُّنَّۃَ وَ اَمَاتُوا البِدعَۃَ

جنہوں نے سنت نبوی کو زندہ کیا اور بدعت کو نابود کر دیا۔

امامؑ نے عمار، ابن تیہان، ذوالشہادتین اور ان جیسے حضرات کو سنت کے زندہ کنندگان کہا، یعنی محی دین، دین قرآن وسنت ہی تو ہے کیونکہ یہی دین کے مآخذ ہیں۔ نہج البلاغہ میں حضرت حجت بن الحسن (عج) کے وجود مقدس کے بارے میں کچھ کلمات ہیں۔ ان میں سے اس وقت مجھے یہ جملہ یاد آرہا ہے:

وَ یُحیِی مَیتَ الکِتَابِ وَ السُّنَّۃِ

وہ زندہ کریں گے کتاب وسنت کو جو بے جان ہو چکی ہونگی۔

یہ الفاظ امام علیؑ کے ہیں، میرے نہیں، امام رضاؑ نے ایک شیعہ سے فرمایا: اَحیُوا اَمرَ نَا، ہمارے امر، یعنی امر ولایت، کو زندہ کرو۔

اس نے عرض کیا: ہم اس کو کس طریقے سے زندہ کر سکتے ہیں؟

حضرتؑ نے حکم دیا کہ ہمارے کلام کے حقائق اور اس کے محاسن اور ہماری سیرت لوگوں سے بیان کرو اور ان کی تشریح کرو، یہی ہمارے امر کو زندہ کرنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس میں نہ کوئی مغالطہ ہے اور نہ کوئی اشکال۔ دین کو زندہ کرنا اور زندہ رکھنا ہمارا فرض منصبی ہے۔ ساتھ ہی دین ہماری زندگی کی اساس ہے بلکہ سب سے بڑی اساس، یہ تو ہوئی پہلی بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اس تقریر کے آغاز میں احیائے دین نہیں کہا تھا لیکن اگر میں یہ بھی کہتا تو کوئی اشکال نہیں تھا مگر پھر بھی ہم ایسی جسارت نہیں کر سکتے۔ میں نے احیائے فکری دینی کے الفاظ استعمال کیے تھے جس کا مطلب ہے دین کے بارے میں خود اپنی سوچ اور اپنے طرزِ فکر کو زندہ کرنا۔

دین زندہ ہے، وہ کبھی نہیں مرے گا، دین مرنے والی چیز نہیں۔ کوئی اُصول اس وقت مر سکتا ہے یا منسوخ ہو سکتا ہے جب کوئی دوسرا اُصول ایسا ہو جو اس کی جگہ لے سکے مثلاً بطلیموس کی ہیت کے اُصول عملی اُصول تھے جو ایک مدت تک دنیا میں زندہ رہے۔ اس کے بعد اور حقائق دریافت ہوئے۔ ہیئت کے نئے اُصول بن گئے جنہوں نے بطلمیوس کے نظریہ کو ختم کر دیا۔ اسی طرح انباذقلس کا عناصرِ اربعہ کا نظریہ بھی یہ ثابت ہونے کے بعد کہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی میں سے کوئی بھی عنصر نہیں ہے، اپنی موت مر گیا۔

لیکن دین کے حقائق اور وہ اُصول جو دین نے بیان کیے ہیں نا قابل تنسیخ ہیں۔ وہ ہرگز نہیں مریں گے، جس چیز کے مرنے کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں وہ دین کے متعلق لوگوں کے افکار وخیالات ہیں۔ دینی فکر مردہ ہوگئی ورنہ خود دین جو کتاب وسنت پر مشتمل ہے نہ مرتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

اسلام کچھ اور ہے اور مسلمان کچھ اور ہیں۔ اسلام زندہ ہے مگر مسلمان اس وقت مردہ ہیں۔ ایک موضوع جو آج کل عمرانیات کے ماہرین کے درمیان زیر بحث ہے وہ عملی طور پر اسلام کا زندہ ہونا ہے۔ اس وقت دنیا کے تمام براعظموں ایشیاء، افریقہ، امریکہ حتیٰ آسٹریلیا میں بھی اسلام ترقی کر رہا ہے۔

اس وقت یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیوں اسلام امریکہ میں خصوصاً وہاں کے پسماندہ طبقہ میں یعنی اس طبقہ میں جس طبقہ میں اسلام نے اول اول ظہور کیا تھا، روز بروز پھیلتا جارہا ہے اور کوئی اس کو روک نہیں سکتا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یورپ میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام دانشوروں، پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے طبقہ میں بھی فروغ پارہا ہے۔ سیاہ براعظم یعنی افریقہ کا عجیب حال ہے۔ مسیحی مبلغین ضخیم بجٹ لے کر شاندار تنظیمیں بنا کر اور بڑے بڑے منصوبے باندھ کر آتے ہیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوتی لیکن اسلام خود بخود ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص تک پہنچ رہا ہے اور اس کا دائرہ برابر وسیع ہورہا ہے۔

ہم جو کہتے ہیں کہ دینی سوچ مرچکی ہے تو یہ ان ملکوں کا حال ہے جو صدیوں سے مسلمان ہیں۔ ان ممالک میں کچھ ایسے عوامل پیدا ہوگئے ہیں کہ لوگوں کے دماغ سے یہ سوچ نکل گئی ہے یا یوں کہیے کہ اب ان کی حالت نیم مردہ، نیم زندہ کی سی ہے۔

احیائے فکری دینی کی جن کو ضرورت ہے، وہ ہم ہیں، ہمارے پاس دین موجود ہے، فکر دینی بھی ہم میں موجود ہے لیکن اس کی حالت نیم خفتہ و نیم بیدار بلکہ نیم زندہ و نیم مردہ کی ہے۔ یہ صورت حال بہت خطرناک ہے اور اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آیئے اب بیٹھ کر سوچیں اور دیکھیں کہ آیا واقعی ہمارا اندازِ فکر اسلامی ہے؟ آیا اسلامی سوچ ہمارے ذہنوں میں زندہ ہے؟ اس وقت اس بات کی زیادہ ضرورت نہیں کہ ہم غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوششیں کریں، گو ہماری آرزو یہی ہے مگر جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم دیندار مسلمانوں میں جو نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور زیارت اور حج کیلئے بھی جاتے ہیں، اسلامی فکر کو زندہ کریں جو اس وقت نیم مردہ حالت میں ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا کچھ کام نہیں بنے گا (اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر لوگ دیندار ہوں مگر دین شناس نہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں) فرض کیجئے کہ یورپ میں کچھ لوگ مسلمان ہوجائیں اور ہمیں موجودہ حالت میں دیکھیں تو ممکن ہے کہ پشیمان ہوکر اسلام ہی سے برگشتہ ہوجائیں۔

عصرِ حاضر میں مسلمانوں کا انحطاط:

چند ممالک میں چھوڑ کر دنیا میں پسماندہ ترین اور بے حیثیت ترین ملک اسلامی ممالک ہیں۔ یہ نہ صرف علم و ہنر میں، صنعت اور ٹیکنالوجی میں اور اخلاق میں پیچھے ہیں بلکہ انسانیت اور روحانیت میں بھی پسماندہ ہی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یا تو ہم اعتراف کرلیں کہ اسلام (یعنی اسلام کی وہ حقیقت جو ہمارے ذہنوں میں ہے) اس کی خاصیت یہی ہے کہ وہ قوموں کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ دشمنان اسلام کے پروپیگنڈے کا سب سے بڑا حربہ بھی مسلمانوں کی یہی حالت زار ہے یا پھر یہ تسلیم کرلیں کہ ہمارے ذہن اور ہماری روح میں اسلام کی اصل صورت موجود ہی نہیں جو کچھ ہمارے ذہن میں موجود ہے وہ محض اسلام کی مسخ شدہ صورت ہے۔ ہماری توحید مسخ شدہ ہے۔ ہمارا نبوت کا تصور مسخ شدہ ہے، ہمارا ولایت وامامت کے بارے میں اعتقاد اور ہمارا قیامت کے متعلق عقیدہ سب مسخ شدہ ہیں۔ اسلام کے تمام اُصول ہمارے ذہن میں محض ایک بدلی ہوئی شکل میں موجود ہیں۔ دین میں صبر ہے، زہد ہے، تقویٰ ہے، توکل ہے لیکن بلا استثناء ہمارے ذہن میں ان سب کی شکل مسخ ہوچکی ہے۔ ان جلسوں میں اب تک جو تقریریں ہوئی ہیں ان سب کی شکل مسخ ہوچکی ہے۔ ان جلسوں میں اب تک جو تقریریں ہوئی ہیں ان سے آپ نے کسی حد تک موجودہ صورت حال کا اندازہ لگالیا ہوگا۔ مثلاً تقویٰ کے بارے میں ہم نے جو بحث کی تھی اس سے، آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہوگی کہ اب تک ہمارے ذہن میں تقویٰ کی جو صورت رہی ہے وہ مسخ شدہ ہے اور دوسرے جن موضوعات پر بحث ہوئی ہے ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی صورت بدل گئی ہے۔

ایک حکایت ہے کہ چند دیہاتی اپنے گاؤں سے شہر گئے، انہوں نے اس سے پہلے شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں انہیں دور سے ایک خاص قسم کے درخت جو نظر آئے تو انہیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیسے درخت ہیں کہ ان درختوں میں نہ شاخیں ہیں نہ پتے۔ دراصل وہ مسجد کے مینار تھے جن کو وہ درخت سمجھے۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ کس قسم کے درخت ہیں کہ جو ہم نے آج تک نہیں دیکھے۔ شہریوں کو بھی درختوں کی خوب واقفیت ہے۔ غرض انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان درختوں کا نام کیا ہے؟ کچھ ہوشیار شہری سمجھ گئے کہ یہ دیہاتی ہیں۔ ان کو ذرا بنانا چاہیے۔ کہنے لگے کہ یہ ایسے درخت ہیں جو دیہات میں نہیں ہوتے۔

دیہاتیوں نے پوچھا کہ پھر انہیں کیسے لگاتے ہیں؟

کہنے لگے کہ ان کے خاص طرح کے بیج ہوتے ہیں جو ہم بودیتے ہیں اور درخت اُگ آتے ہیں۔

انہوں نے کہا کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ کچھ بیج ہمیں بھی دے دو؟

انہونے گاجر کے تھوڑے سے بیج ان کو دے دیے۔

انہوں نے واپس جا کر وہ سب بو دیے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی گاجر کاشت نہیں کی تھی۔ کچھ دن بعد دیکھا تو کچھ بھی نہیں لگا۔ انہوں نے انتظار کیا۔ خوب پانی دیا لیکن کچھ نہ نکلا، جب ایک مدت گزر گئی تو آپس میں کہنے لگے کہ کیا بات ہے جو آج تک درخت نہ نکلے۔ آخر کھودا تو دیکھا کہ مینار کی شکل تو ہے لیکن وہ مینار بجائے اوپر آنے کے زمین کے اندر چلے گئے۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے بیج اُلٹے بو دیئے۔ ہمارے اسلام اور مسلمانی کا قصہ بھی ان ہی دیہاتیوں کا سا ہے جنہوں نے میناروں کی کاشت کی تھی۔

مسئلہ ولایت وامامت میں بھی ہمارے اندازِ فکر نے عجب معکوس صورت اختیار کر لی ہے۔ کیا تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہمارے پیشوا تو اہلبیتؑ پیغمبرؐ ہیں۔ ہمارے پاس علی ابن طالبؑ ہیں، حسنؑ ابن علیؑ ہیں حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ زین العابدینؑ ہیں۔ اسی طرح اور باقی آئمہ ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ان ائمہ کا وجود ہمیں عمل کی ترغیب دیتا ہے وہ ہمارے لیے ایک طرح کا نشہ اور سستی اور عمل سے گریز کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم نے تشیع اور ولائے اہل بیتؑ کو اپنی اسلامی ذمہ داریوں سے بچنے کیلئے ایک بہانہ بنالیا۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ خیال کس قدر مسخ شدہ ہے اور ایک بلند پایہ حقیقت کی بگڑی ہوئی شکل نے ہمارے ذہن پر کیسا الٹا اثر کیا ہے۔ ہم خود کچھ نہیں کرتے بس اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مولا خود ہر بگڑی بنا دیں گے۔

میں اسلام کی ابتدائی تاریخ سے ایک قصہ نقل کرتا ہوں۔

شیعہ اور مرجعہ کا فرق:

متکلمین کا ایک گروہ مرجعہ کہلاتا تھا۔ بحمد للہ اب یہ فرقہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اس کے قائل تھے کہ اگر ایمان سلامت ہو تو کسی عمل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ان کے اس عقیدہ کا محرک سیاسی مصلحت تھی۔ یہ لوگ بنی امیہ کے زمانے میں تھے اور انہیں ان کی تائید حاصل تھی۔ یہ لوگ اس طرح امرا و سلاطین بنی امیہ کے اعمال کیلئے ایک وجہِ جواز مہیا کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں تاریخ کہتی ہے۔ یہ کہتے تھے، جناب اگر آپ کا ایمان درست ہے تو پھر عمل کی کوئی اہمیت نہیں۔ عمل کرو تو کرو، نہ کرو تو نہ کرو۔

عمل کوئی چیز نہیں۔ جب بنی امیہ کا زوال آ گیا تو بنی عباس نے اس دشمنی کی بنا پر جو انہیں بنی امیہ سے تھی مرجعہ کی بیخ کنی کر دی لیکن افسوس کی بات ہے کہ اب مرجعہ کی سوچ نے شیعوں کے دماغ میں جڑ پکڑ لی ہے حالانکہ جو قصہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاً شیعہ عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ احمد امین مصری نے "ضحیٰ الاسلام" میں ابوالفرج اصفہانی کی "اغانی" سے ایک روایت نقل کی ہے۔ خود احمد امین کا رجحان شیعوں کے خلاف ہے لیکن بہر کیف انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔

ایک شخص جس کا انہوں نے نام بھی لیا ہے، وہ کہتا تھا کہ ایک شیعی اور ایک مرجیٔ اپنے عقائد کے بارے میں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا مرجعہ کے اُصول زیادہ صحیح ہیں، دوسرا کہتا تھا شیعہ کے۔ مرجیٔ کہہ رہا تھا کہ عمل کوئی چیز نہیں، اصل چیز صرف ایمان ہے۔ شیعی کہہ رہا تھا کہ عمل ضروری ہے۔ اسی اثناء میں وہاں ایک گویا آنکلا (میں گویا اس قرینہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ یہ اغانی کی روایت ہے) دونوں نے کہا آؤ اس سے پوچھ لیں۔ یہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگے، اس سے یہ پوچھتے ہیں کہ شیعہ حق پر ہیں یا مرجعہ؟ اس سے پوچھا گیا کہ میاں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ شیعہ حق پر ہیں یا مرجعہ؟

اس نے جواب دیا۔ کہنے لگا: میرا اُوپر کا حصہ شیعی اور نچلا حصہ مرجیٔ ہے

اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں فکر اور عقیدہ میں شیعہ ہوں مگر عمل کے لحاظ سے مرجیٔ یعنی میں شیعہ عقائد کو تسلیم تو کرتا ہوں مگر ان کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ اب ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم ایسی قوم بن گئے ہیں کہ فکر کے لحاظ سے بھی مرجیٔ ہیں اور عمل کے لحاظ سے بھی۔

یہی وہ مسئلہ ہے کہ جس کے مطابق کہنا چاہیے کہ ہماری دینی سوچ نیم مردہ ہو چکی ہے یا یوں کہوں کہ مر گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہماری سوچ ہی مرجعہ کی سی ہو گئی تو اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ جب سوچ یہ ہو کہ عمل کی ضرورت ہی نہیں تو پھر کیا دنیا رہ سکتی ہے؟ آخرت رہ سکتی ہے؟ عزت رہ سکتی ہے؟ انتم الاعلون کا استحقاق رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ہماری دینی فکر کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ دین کے بارے میں ہمارا اندازِ فکر غلط ہے۔ میں کہنے کی جسارت کروں گا کہ چند عبادات کے فروعی مسائل اور چند معاملات کو چھوڑ کر دین کے بارے میں ہماری سوچ قطعاً درست نہیں۔ ہم نہ اپنے خطبوں اور وعظوں میں صحیح بات کہتے ہیں، نہ کتابوں، اخباروں اور

رسالوں میں صحیح بات لکھتے ہیں اور نہ ہی صحیح طریقے سے سوچتے ہیں۔ اس سے قبل کہ ہم دوسروں کو مسلمان بنانے کی فکر کریں ہمیں خود اپنی خبر لینی چاہیے۔ مسجد میں چراغ جلانے سے پہلے اپنے گھر کا دیا روشن کرنا چاہیے۔

جو لوگ دنیا پر یا آدھی دنیا پر حکومت کر رہے ہیں ان کی سیاسیات کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام نہ مرے اور نہ زندہ رہے۔ اس کی حالت بین بین رہے نیم مردہ و نیم زندہ آج دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک مشرقی بلاک اور ایک مغربی بلاک۔ ان دونوں میں صرف دو مسئلوں پر اتفاق رائے ہے۔ ایک جرمنی کا مسئلہ اور دوسرے اسلام کا مسئلہ، بظاہر جرمنی کے مسئلہ پر دونوں بلاک آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں لیکن اندرونی طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قوم دوبارہ زندہ نہ ہونے پائے اور اس کو آزاد نہ چھوڑا جائے۔ بالکل یہی صورت اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہے کہ مشرقی بلاک تو یہ چاہتا ہے کہ اسلام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور مغربی بلاک کی سوچ یہ ہے کہ اسلام کو نیم زندہ اور نیم مردہ حالت میں باقی رہنے دیا جائے یعنی موجودہ صورت حال کو قائم رکھا جائے۔ نہ اسلام کو ختم کیا جائے اور نہ ہی اسے صحیح طریقے سے زندہ ہونے دیا جائے۔

یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ حشریات یا کیڑے مکوڑوں کی نفسیات سے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک کیڑا جو بھڑ سے چھوٹا اور مکھی سے بڑا ہوتا ہے اس کی فطرت ایسی عجیب ہے کہ مادّہ پرست حیران ہیں کہ اس کی توجیہہ کیسے کی جائے۔ کہتے ہیں کہ جب اس جانور کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو یہ ایک کیڑا تلاش کرتا ہے جس کی پیٹھ پر ایک بہت ہی نازک پٹھا ہوتا ہے۔ یہ اس کیڑے کی پشت پر سوار ہوجاتا ہے اور اس پٹھے کو تلاش کر کے ایک خاص مقام پر ڈنک مارتا ہے لیکن اس طرح آہستہ سے ڈنک مرتا ہے کہ وہ کیڑا مرنے نہ پائے بلکہ بے حس ہو کر اپنی جگہ پر پڑا رہے۔ اس کے بعد اس کیڑے کی پشت پر اسی جگہ انڈے دیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انڈے دینے کے بعد بچے نکلنے سے پہلے ہی خود مرجاتا ہے۔ اس طرح نہ یہ اپنی نسل کو دیکھتا ہے نہ بچے اس کو دیکھتے ہیں۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو وہ اسی کیڑے کے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کیڑا ختم ہوجاتا ہے اور بچے بڑے ہو کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اب یہ جانور اس کیڑے پر اس قدر ڈنک کیوں نہیں مارتا کہ وہ مرجائے؟ اس لیے کہ اگر وہ مرجائے تو جلد ہی گل سڑ کر ختم ہوجائے گا، ڈنک کیوں مارتا ہے؟ اس لیے کہ وہ بے ہوش ہوجائے

اور حرکت نہ کر سکے کیونکہ حرکت کرنے کی صورت میں اس پر انڈے نہیں دے سکتا اور بچے اس کے گوشت سے غذا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے وہ اس کو نیم مردہ و نیم زندہ حالت میں چھوڑ دیتا ہے تا کہ وہ مرے بھی نہیں اور اس میں اس قدر زندگی بھی باقی نہ رہے کہ وہ حرکت کر سکے۔ اس جانور کی یہ فطرت عجیب ہے کہ وہ خود مرجاتا ہے اور بعد کی نسل پہلی نسل کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے باوجود جب یہ دوسری بڑی ہوجاتی ہے اور اس کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو یہ بھی اسی مہارت سے وہی ٹیکہ لگانے کا عمل انجام دیتی ہے حالانکہ نہ اس نے پہلی نسل کو دیکھا تھا اور نہ یہ عمل اس سے سیکھا تھا۔ یہ صورت ہوتی ہے نیم مردہ و نیم زندہ کی۔

میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی استعماری طاقت نے ہماری یہ حالت کر دی ہے۔ یہ بات نہیں، یہ حالت تو ہماری پہلے سے ہی تھی البتہ وہ لوگ ہمیں اسی حال میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس حالت سے چھٹکارا نہ پا سکنے کی وجہ وہ ضرور ہیں مگر وہ خیالات جنہوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا بعض اسباب کی بنا پر بتدریج استعمار و استثمار کے آنے سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔

لینن نے کہا تھا کہ مذہب سوسائٹی کیلئے افیون ہے۔ ایک عرب نے ایک دوسرے مادہ پرست فلسفی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مذہب کمزوروں کا زبردستوں کے خلاف انقلاب ہے۔ یہ عرب مصنف پوچھتا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی بات صحیح ہے۔ مذہب افیون اور بے حسی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے یا یہ انقلاب اور تحریک ہے۔ عرب مصنف کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مذہب زندگی ہے، حرکت ہے، بیداری ہے مگر کونسا مذہب؟ وہ مذہب جو پیغمبر لائے ہیں۔ ساتھ ہی مذہب معاشرے کیلئے افیون بھی ہے مگر کون سا مذہب؟ وہ معجون مرکب جو ہم نے خود تیار کی ہے۔

اب میں ایک حدیث سنا کر اپنی معروضات ختم کرتا ہوں۔ ایک مشہور حدیث ہے:

اِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فَعَلَى الْعَالِمِ اَنْ يُظْهِرَ عِلْمَهٗ وَاِلَّا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ

اگر لوگوں میں بدعات پھیل جائیں تو عالم کا فرض ہے کہ اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہوگا۔

بدعت وہ کام ہے جو مذہب کے نام پر کیا جائے۔ لوگ اسے دین کا جزو سمجھیں حالانکہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس حدیث شریف کے مطابق احیائے دین درجہ اول میں علماء کی ذمہ داری ہے۔

ان کا فرض ہے کہ وہ بگاڑ اور بدعات کا مقابلہ کریں۔

مجھے اُمید ہے کہ اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکیں گے کہ ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے ایک اسلامی انقلاب، اسلامی اندازِ فکر کا احیاء اور اسلامی بیداری، مجھے امید ہے کہ میں کسی مناسب موقع پر اسلامی اندازِ فکر کی خصوصیات، اس کے پیدا کرنے کا طریقہ اور اس کا پروگرام بیان کرسکوں گا۔

آج کی بحث محض احیائے تفکرِ اسلامی کا مقدمہ اور تمہید تھی۔

سوالات

۱۔ احیائے فکرِ دینی کی کیا ضرورت ہے؟

۲۔ دین کی اہمیت کیا ہے؟

۳۔ امر ولایت کو کیسے زندہ کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ دینی سوچ کن ممالک میں مرچکی ہے؟

۵۔ استعمار اسلامی معاشرے کو نیم مردہ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟

۶۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کا انحطاط کیوں ہورہا ہے؟

۷۔ بدعت سے کیا مراد ہے؟

۸۔ اسلامی انقلاب اور بیداری کیوں ضروری ہے؟